Registered No. L. 4186

جلد ۱۷ — عدد ۶

ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ۸ر

قیمت سالانہ ۵ر

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصّہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں ۵ نسخے — علاوہ محصول ڈاک

نو روپے میں ۵۰ نسخے
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے
} کرایہ ریل بذمہ خریدار

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

۲ روپے ۴ آنہ میں ..... ۵ نسخے
محصول ڈاک بذمہ خریدار

۱۱ روپے ۸ آنہ میں ۲۵ نسخے
۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے
۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے
} کرایہ ریل بذمہ خریدار

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

(حصہ سوم)

از

ابوالاعلیٰ مودودی

فہرست مضامین

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الکٹرک پریس سرکلر روڈ لاہور میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن

پونچھ روڈ مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کریگا کہ میں نے حصہ دوم کی اشاعت کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جسکی توضیح یہاں کردینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان نہ پیش آئے۔

یہ بات تھوڑے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اسے صرف ان لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اسکو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اسکی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اُسکے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر کرنی پڑتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہرحال بیگانوں کی بہ نسبت اُس سے قریب تر ہیں۔ اسکو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا

ہے کہ انحطاط کا عمل اُنکے اندر کہاں تک ہوچکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک اُن میں باقی ہے۔ پھر اسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دور نکل گئے ہیں اُس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر انکے اندر باقی ہے وہ محفوظ رہے اُنکی حیثیت اس تحریک کے حق میں بالکل اُس سرمایہ کی سی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کچھا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ جو کچھ اسکا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہذا اسکے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی سردست ہے اسکو کم از کم اسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اسکو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اسکے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر بھی ٹھیرنے نہ دے بلکہ اصل تحریک کی طرف انکو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور انکی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گذر کر پھر کہیں اسکے لیے دعوتِ عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیش نظر تحریک اسلامی کا احیاء ہے اسلیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جسکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد اُن میں پیدا ہو رہا ہے اسے روکا جائے۔ ابھی یہ کوشش جاری ہی تھی کہ ۱۹۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اسکے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگرسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقہ اثر میں ہیں ہم انکو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربطِ عوام کی تدبیروں سے، اور اپنی واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم

کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کرلے، اور انکے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کردے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اُتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو اور زیادہ پریشان کن جس چیز نے بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ اس وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کرلیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہٰذا اس خطرے کا سدّ باب کرنے کے لیے میں نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۸ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۹ء کے آغاز میں شائع کیا۔ ان دونوں مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبہ سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کردیں۔ اسلیے میں نے انکے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، انکو اس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جارہا تھا، اُن آئینی تحفظات اور "بنیادی حقوق" کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کرکے مسلمان اس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور انکے سامنے شبہ دار الاسلام کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پراگندگی انکے اندر پیدا ہوگئی ہے وہ بھی دور ہو اور انکو نظر جمانے کے لیے ایک ایسا مطمح نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی نصب العین کی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اسکی بلندی کو دیکھ کر انکی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اُس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومت خود اختیاری، اقلیت اور اکثریت وغیرہ چیزوں کے متعلق رائج الوقت تصورات کے خلاف کچھ کہنے سے قصداً احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے انکو جوں کا توں قبول کرکے اُسی زبان میں

گفتگو کی جسکو لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوب اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالتِ واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی چھلانگ میں مقصد بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصد قریب سے بھی ہاتھ جانے کی موجب نہ بن جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دینگے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں نتھی کرا لینگے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اُسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جنکی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اُس نتیجہ پر مطمئن ہو جانے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انہیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے انہی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے انہوں نے سیکھے ہیں یا انکے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمح نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انہیں اب یہ بتایا جائے کہ تمہاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب نہ پیش آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اسکے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ حصہ دوم کی اشاعت کے فوراً

ہی بعد اِن مضامین کا سلسلہ شروع کردوں جنکا مجموعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے:

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی حرکت کے دور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی کلیتہً ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم و عمل سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کررہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اُتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں حاصل نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علماء کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک برابر اصرار کیے چلے جارہے ہیں، اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمارِ دین سے ہٹ کر اس شدّت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو انکے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہوجانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھودی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس نئی تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزء اتنا کم اور قوم پرستانہ جزء اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سُنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں انکی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہرحال

کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے اُنکے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا موجب نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو۔ لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملیگی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جنکے تحت اس مجموعہ کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں انکے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاھد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی اپنے دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی ہر رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ اُنکی پارٹی یا اُنکی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے کچھ بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کی اور اُنکے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میں نہ اُنکی گالیوں کا جواب دونگا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹونگا۔

ابوالاعلیٰ

تعارُفِ مقصد

قوانین فطرت سب کے سب بلا استثنار، دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ ہوا آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہیگی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصہ میں ہے وہی دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رو رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالیگا، جل جائیگا۔ جو زہر کھائیگا مر جائیگا۔ جو غذا کھائیگا، قوت اور نشو و نما پائیگا۔ فطرت کے حدود و فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اُسی فطرت کا ایک رخ ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے، لہذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرت کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ علم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہیگا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت

دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی
حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح
گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے
لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ
نہ ہو۔ اسبابِ سعادت اور اسبابِ شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کریگا
وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا کہ اسکا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے"
اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کریگا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا
جائیگا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرت انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اسکو
انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطر کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے
یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کسی
طبقاتی لیڈر کی پروازِ فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا
ہے۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی
خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مقیّد ہو۔ یہ تو درحقیقت ربُّ العٰلمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے
اور رب العٰلمین وہ ہے جسکی نگاہ میں سب انسان یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے
دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور اٹالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے
اسکو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اسلیے وہ دیانت، اخلاق اور
مدنیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک ہیں۔ اُن میں
بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ان کی کامیابی مدنظر رکھی گئی

ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ اُن کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کریگا، فلاح پائیگا، خواہ وہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کریگا، نقصان اٹھائیگا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انہی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیر کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اسلام کی صداقت پر ایمان لائے۔ اور چونکہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اسلیے یہی ہماری تمام کوششوں کا مقصدِ اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکّن چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی "قوم" میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" انکا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئیرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقۃً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے دائرۂ اسلام میں داخل ہیں، اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو انکی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائیگی کہ اتفاق سے حکمراں کلمہ گو ہیں، مگر

ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہوسکیگا
حاشا و کلا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم
کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسند حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت
اور فرمانروائی کے تکبر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کرلیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم
اور مفسد ٹھیرائیگا کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا

"آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انہی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی
نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں"

درحقیقت جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ "اسلام کی حکومت" ہے،
اسی اسلام کی جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری
یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر
ایمان لائے اور اُن پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی
بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے
شرفا اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جنکے خاندان میں اسلام چلا آرہا ہے
وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں انکی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو
شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی
اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی
کے اونچے سے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ

نظام تمدن کو اُن اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اس پر اگر کوئی ناک بھوں چڑھائے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسکے پاس آخر وجوہ اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی تعلقات و معاملات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اسکے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائیٹی کے ساتھ اسکی زندگی و موت وابستہ ہے، جس حصۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اسی کے نظام حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں محبِ انسانیت یا حبِّ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اُس مسلکِ حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ انکی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوشحالی مضمر دیکھتا ہے، اور اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی حکمرانی کا مخالف ہوگا جنکو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلاف حُبِ وطن (Unpatriotic) نہیں ہے۔ بلکہ خلاف حُبِ وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ موجب فلاح سمجھتا ہو اسکو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظام تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیر نو Social reconstruction

مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جا سکتی ہے کہ اُنکے ایمان واعتقاد کا مقتضیٰ یہی ہے؟ کیا انکے اس اقدام کو کوئی شخص خلاف حُبِ وطن یا خلاف حُبِ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا انکے حق میں یہ راستبازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت وفلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسکو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظام زندگی کی حکمرانی کو گوارا کرلیں جو انکے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوام عالم کے درمیان اہلِ وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راستباز اشتراکی سے آزادی اور وطنی عزت کے نام پر یہ اپیل کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اس طریقہ کو قبول کرلیں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سُن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی وتحقیقی مطالعہ کیا۔ ہم نے اسکی اعتقادی اساس، اسکے نظریۂ حیات، اسکے اصول اخلاق، اسکے نظام تمدن، اسکے قوانین معاشرت ومعیشت، اسکے آئینِ سیاست وطرزِ حکومت، غرض اسکی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو بھی کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعہ اور تحقیق وتنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کردیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح وسعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اسکے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development of personality) کا پورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل

Social justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں ہے۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اسے عزت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد Capacity کے مطابق اخلاقی روحانی اور مادّی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راستبازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت پر میں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح "مذہبیت" کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شائد میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی

طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیات قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے روشناس کیا جس کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی (Scheme of life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرام فلکی کے قانون جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظام اسلامی بھی اُسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس میں درحقیقت ایک نومسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل اور دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اُس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ ہم اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف اور عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کی

وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ Domination کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے نہیں بچ سکتی کہ یہ حوصلہ مند Ambitious قوم اب اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ انکے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلت تعداد کے پیچیدہ مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستہ میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اسکو محض اسکے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر انکے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر "اسلام ازم" کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور اب اس جمہوری دور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑیگا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی ہی رہی ہیں۔ شیطانی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہرحال موانع سے بسر بند رہتی ہے۔

محض صبر، لگاتار سعی اور خالصتہً لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائینگے کہ اسلام کسی نسل یا قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اسی طرح تمہاری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانونِ الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملیگی، تقدم اور شرف تمکو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہوگے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائینگے۔ یہاں برہمنیت یا نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دوامی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغ اسلام کی نوعیت اچھوت ادھار کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کے ووٹ بڑھانے کے لیے اُسکی جز بنائی جائے مگر زندگی کی متاع میں اسکو برابر کا حصہ نہ دیا جائے۔ اسلام میں تم برابر ہی نہیں بلکہ اپنے اوصاف ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اسکے نسب یا اسکے پیشے یا اسکی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اڑنے کی طاقت رکھتے ہو اڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمہاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کی ایک تحریک ہے، اسکو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے کا

کونسا موقع ہے؟

جو لوگ دور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں انکی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن کا غائر مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اسلیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر بیٹھے ہیں کہ اسلام اب سے ۱۳ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اُس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلا شبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں، اس زمانہ کی حالات میں وہ پرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا ــــ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے، انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانہ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا ــــ حالانکہ اگر ایک سلیم الفطرت آدمی اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بآسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانے کی مذہبی تحریک نہیں ہے جسکی بنیاد وقتی اور مکانی حالات پر ہو۔ بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانین فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اسکی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہر حال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طوفان نوح کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں اور وہی ننشہ عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہونگے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق

(Application) میں ہوگا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظام اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے

انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اُسے قبول کرتے ہیں اُنکی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ اُن سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جنکی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصولوں کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، اُنکے خصائل میں تغیر آجاتا ہے، یہاں تک کہ انکی شکل و صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اسکے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اُسے چلانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اُسکے مقاصد اور اُسکے اصول خود ہی آدمیوں کی اُس بھیڑ میں سے جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں، اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اسکے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں انکی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ انکی اولاد بھی اسی مسلک پر اُٹھے جسکو خود انہوں نے حق پاکر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انکے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اس مسلک کی روح اور اسکے اصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک

حد تک ہی ہوتی ہے۔ پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے مگر فطرت دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی افتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح اس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور اُن سب نے اُسکو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اسکی طرف کھینچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہونگے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ اُن میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہونگے۔ عمرؓ اور خالدؓ بھی ہونگے۔ اور ابوبکرؓ بھی ہونگے جس طرح آزر کے گھر میں ابراہیمؑ حنیف پیدا ہوسکتا ہے اُسی طرح نوحؑ کے گھر میں عمل غیر صالح بھی پیدا ہوسکتا ہے اور ہوا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق یہ لازمی امر ہے کہ اس سوسائٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنی طبیعت کے رجحان کے لحاظ سے اسکے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اسکے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اسکے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی اپنی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ انکی پوری نئی پود کو انکے مسلک کا حقیقی متبع بنادے۔

اس خطرے کے سدِ باب، اور تحریک کو اسکے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں تکفیر[۱] کے ذریعہ سے

---

[۱] موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں اسی چیز کو (Purge) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنے دائرے سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے علانیہ منحرف ہوجانے والوں کو قتل تک کردیا جاتا ہے۔

انکو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں اُن نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جنکو اس کے اصول و مقاصد اُسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیرووں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اسکے سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی اس جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اسکے مسلک سے، اسکے اصولوں سے اور اسکے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اسکے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس مسلک کا اور ان اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے جن پر ابتداءً وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور

محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اسکی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اسکو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اس کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلالحاظ اسکے کہ صاحب زادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے، بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلہ میں پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اسکے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور ایک اصول کو لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اسکی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہوگئی۔ اسکا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اسکے اصولوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اسکے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جائیے۔ "مسلمان رنڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئینگی اور "مسلمان زانی" گشت لگاتے ملینگے۔ جیلخانوں کا معائنہ کیجیے۔ "مسلمان چوروں"، "مسلمان ڈاکوؤں"، اور "مسلمان بدمعاشوں" سے آپکا تعارف ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خواری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا

پائینگے۔ سوسائیٹی میں بچہ بچہ ہے۔ کہیں آپکی ملاقات "دو مسلمان شرابیوں" سے ہوگی۔ کہیں آپکو "دو مسلمان قمار باز" سے ملینگے۔ کہیں "دو مسلمان سازندوں"، اور "دو مسلمان گوئیوں"، اور "دو مسلمان بھانڈوں" سے آپ دوچار ہونگے۔ بھلا غور تو کیجیے، یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کردیا گیا ہے اور کن کن صفات کیساتھ جمع ہو رہا ہے۔ مسلمان اور زانی! مسلمان اور چور! مسلمان اور شرابی! مسلمان اور قمار باز! مسلمان اور رشوت خوار! اگر وہ سب کچھ جو ایک کافر کر سکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کرنے لگے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بداخلاقیوں کو مٹانے کے لیے اٹھی تھی۔ اس نے تو مسلمان کے نام سے ان چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاحِ اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس نے اپنی جماعت میں ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مار مار کر ہلاک کردینے کی، کوڑے برسا برسا کر کھال اڑا دینے کی، حتی کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے زنا کو مٹانے اٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جائے، جسکا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خواروں کے وجود سے خالی ہو، جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو۔ اسکا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں دنیا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار لوگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جعلسازی، اور رشوت خواری تو درکنار، اس نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گویا ہو، کیونکہ مصلحینِ اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے۔ جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیریکٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اسکی رسوائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ رنڈی اور بھڑوے اور زانی اور چور تک کے ساتھ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگ جائے۔

کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہوجانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اسکے آگے عقیدت سے جھک جائیں اور آنکھیں اسکے لیے فرشِ راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی

خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اسکے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ اس سے اونچے تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک نسلی قومیت کا نام ہے اور جو شخص مسلمان ماں باپ کے ہاں پیدا ہو گیا ہے وہ بہرحال مسلمان ہے خواہ وہ عقیدہ و مسلک اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے اسلام کے ساتھ کوئی دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا ہو۔ سوسائٹی میں آپ چلیں پھریں تو آپ کو ہر جگہ عجیب و غریب قسم کے "مسلمانوں" سے سابقہ پیش آئیگا۔ کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی وہ "مسلمان" ہی۔ ایک دوسرے صاحب خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں مگر انکے "مسلمان" ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے مگر ہیں یہ بھی مسلمان۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریمتی جی بنائے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے وائلن بجوا رہے ہیں، مگر آپکے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چسپاں ہوا ہے۔ ایک دوسرے حضرات شریف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام فرائض سے مستثنیٰ ہیں، شراب، زنا، رشوت، جوا اور ایسی سب چیزیں انکے لیے جائز ہو چکی ہیں، حلال اور حرام کی تمیز سے نہ صرف خالی الذہن ہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی انکو یہ معلوم کرنے کی پروا نہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے، خیالات، اقوال اور اعمال میں انکے اور ایک کافر و مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا، مگر ان کا شمار بھی مسلمانوں ہی میں ہوتا ہے۔ غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لینگے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا "مسلمان" نظر آئیگا، مسلمان کی اتنی قسمیں ملینگی کہ آپ شمار نہ کر سکینگے یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے، کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے!

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہوگیا ہے کہ "مسلمان" جو کچھ بھی کرے وہ "اسلامی" ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام "اسلامی بینک" ہوگا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ "اسلامی انشورنس کمپنی" ہوگی۔ یہ جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ "اسلامی یونیورسٹی" "اسلامیہ کالج"، یا "اسلامیہ اسکول" ہوگا۔ انکی کافرانہ ریاست کو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جائیگا۔ انکے فرعون اور نمرود "اسلامی بادشاہ" کے نام سے یاد کیے جائینگے۔ انکی جاہلی زندگی "اسلامی تہذیب و تمدن" قرار دی جائیگی۔ اِن کی موسیقی، مصوّری اور بت تراشی کو "اسلامی آرٹ" کے معزز لقب سے ملقب کیا جائیگا۔ اِن کے زندقے اور اوہام لاطائل کو "اسلامی فلسفہ" کہا جائیگا۔ حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہوجائینگے تو "مسلم سوشلسٹ" کے نام سے پکارے جائینگے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں، اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ "اسلامی شرابخانے"، "اسلامی قحبہ خانے"، اور "اسلامی قمار خانے" جیسی اصطلاحوں سے آپکا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو "اسلامی کفر" یا "اسلامی معصیت" کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح (Contradiction in terms) کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دوکان پر آپ "سبزی خوروں کی دوکانِ گوشت"، یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موحدین کا بت خانہ" سنیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہوسکیگی۔

جب افراد کی ذہنیتوں کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اس تناقض سے متاثر نہ ہونا امرِ محال ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، خود مسلمان پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی نا کہ سرکاری ملازمتوں

میں ہمیں جگہیں ملیں۔ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ شریعت ساز مجلسوں (Legislatures) کی نشستوں میں کم سے کم اتنا تناسب ہمارا ہو۔ من لم یحکم بما انزل اللہ میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت میں غالب حصہ ہمارا ہی رہے۔ اسی کی ساری چیخ پکار ہے۔ اسی کا نام اسلامی مفاد ہے۔ اسی محور پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اسکی عین ضد ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا یہی نقطۂ نظر ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیرووں کو کل پرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کی حفاظت کا سوال اٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گرانڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کے بقاوفنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج روسی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی پارٹی میں رہنے دیا جائیگا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آرمی میں داخل ہو کر نازیت کو سربلند کرنے کی کوشش کرنے لگے تو کیا آپ اسکی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شائد انتہائی اضطرار کی حالت میں دیتا، اور جسکو حلق سے اتارنے کے لیے غیر باغٍ ولا عادٍ کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سور کھایا جا سکتا ہے اُسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدر سدرمق کھالو، یہاں اس روٹی کو نہ صرف ھل من مزید کہہ کر پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر کفر و اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو

اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اور ایک مصلح تمدن کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو سن کر دنیا مذاق اڑانے لگے۔ کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اسکے وقار کو اور اسکے دعوے کو اپنے معبودِ شکم کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپکے ہاں ایک صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ ایک فوجی تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ تمہاری شوکت رفتہ کو پھر تازہ کرونگا اور تمہیں زمین میں غلبہ دلوا کر چھوڑونگا۔ آپکے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی انکی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں ان سے فلاح و کامرانی کی آس لگاتے ہیں۔ آپ کا پریس اِدھر سے اُدھر تک انکی حمایت کرتا ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیرِ مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ انکے عقائد، اُنکے فہم قرآن، اُنکے اخلاق، اُنکی گفتار، اُنکے اعمال، اور ان کے طریق کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھ لیں۔ ایک شخص اسلامی اصطلاحات کے پردے میں میکیاویلی، مڈاروِن، ارنسٹ ہیکل اور کارل پیرسن جیسے لوگوں کے نظریات پیش کرتا ہے، قانون طبعی اور قانون شرعی کو خلط ملط کر کے اسلام کی جڑ بنیاد تک اکھاڑ پھینکتا ہے، ایمان، اسلام، تقویٰ، عبادت، توحید، رسالت، جہاد، ہجرت، اطاعت امر، جماعت، سب کے مفہوم بدل کر رکھ دیتا ہے، اور تم زہر کے یہ سارے گھونٹ محض اس لالچ میں حلق سے اتار جاتے ہو کہ یہ "مسلم قوم" کی عسکری تنظیم تو کر ہی دیگا۔ ایک شخص علانیہ جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، اپنی بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی خوب تذلیل و تضحیک کراتا ہے، غیر مسلموں کے مقابلہ پر آ کر پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے وقار کو بچانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے

پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے واپس نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور اسکے باوجود اس کے پیچھے لگے رہتے ہو محض اس امید میں کہ یہ ہمیں دنیوی کامرانیوں سے ہمکنار تو کر دیگا۔ ایک شخص کی تحریر و تقریر اور ایک ایک حرکت سے دنائت، سفلہ پن اور بازاریت ٹپکی پڑتی ہے، تقوٰی، صداقت اور وقار کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور تم اسکی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ وہ پچاس ہزار مسلمانوں کی جانیں غیر الٰہی حکومت کی خدمت کے لیے بار بار پیش کرتا ہے اور اس خدمت گذاری کا فائدہ تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس بہانے تم کو عسکری ٹریننگ مل جائیگی اور تمہاری فوجی پوزیشن مضبوط ہو جائیگی۔ تم اس ذلیل تدبیر کی خوراک بھی حلق سے نیچے اتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک فوجی تنظیم کرنے والا امیر تو مل گیا۔ یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمہارا معیار اخلاق وانسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعوٰی کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیے بلکہ اسکو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہییں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے الٹا اسی کو کاٹ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دھریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اسکی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ، ہو مسلمان کے جداگانہ وجود کے لیے کونسی وجہ جواز رہ جاتی ہے؟

اور اوپر چلیے۔ آپکی سب سے بڑی قومی مجلس، مسلم لیگ، جسکو آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوٰی ہے، ذرا اسکو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ موجودہ جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا، اس کو

پڑھیے اور بار بار پڑھیے - اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرزِ عمل، اور ایک ایسی جماعت کے طرزِ عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اوّل نظر میں آپکو محسوس ہو جائیگا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے - اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے، تو اس کے آئینہ میں ہر صاحب نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے - مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے، اس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اسکی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی - آپ مسلم کے بجائے، سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں - یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اُسکے ساتھ وابستہ کر دیجیے اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں - اسکے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان اب اُسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی دوسری تمام قومیں ہیں - ایک موقع و محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے - وہ بھول گیا ہے کہ میں اوّلاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں - اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے، اور یہ کہ میں اس صورت حال میں سے اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں، تو پھر "مسلمان" کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی - ایسا طرزِ عمل تو اگر میں نامسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی مجھے ہوا بھی نہ لگی ہوتی تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا -

میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اُس قوم کے لیے جو ہندوستان میں بستی ہے مفید ہوگی یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس قوت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے، اُس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب مسلم لیگ کے ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ اِن لوگوں کو ایک موقع، اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاق مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے انکو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیرو کار ہیں، اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین روح کا حامل ہے، اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیتے۔ اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مترتب ہوتا، اُس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے ہم کو پہنچنے کا اندیشہ تھا، اور کوئی فائدہ جو اُس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے، قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہے جیسی دنیا میں دوسری اور قومیں ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس بعد اسلامی سیاست ہے ۔۔۔ حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے

لیے ازالۂ حیثیت عرفی سے کم نہیں!

"مسلمانوں" کی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پہلوؤں سے یہ چند مثالیں جو میں نے پیش کی ہیں، یہ سب ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اس وقت تنزل و انحطاط کے اُس آخری مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا نام باقی رہ جاتا ہے، اور اس نام کا اطلاق، "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے بمصداق، اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اسکے اصل معنی کی ضد ہوتی ہیں۔ نظریات غیر اسلامی اور نام انکا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور انکا نام بھی مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ رویّہ غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان کا بے تکلف اطلاق۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی کے ادنیٰ ترین طبقوں سے لیکر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لیکر بڑی سے بڑی مجلسوں تک، ہر طرف اسی ایک وبائے عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے دل نے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا، جسکے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکتی تھی، آج اسکی کشور کشائی و عالمگیری آخر کس چیز نے چھین لی؟

اسکا جواب ہر بار مجھے یہی ملا کہ اسلامی تحریک پر تنزل و انحطاط کے اُسی قانون کا عمل جاری ہوا ہے جسے میں ابتدا میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح کی صورت اسکے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سرِ نو ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ مُردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے بہت مسلمان دل ابھی حرکت کر رہے ہیں، اور جنکی گہرائیوں سے ابھی تک یہ شہادت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریق اسلامی ہی میں ہے، انکو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام یہی ہے۔۔۔ مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ وہ کوہ کنی ہے جسکے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا۔

نسلی مسلمانوں کیلیے دو راہیں

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہر حال اسکی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں:

پہلی شرط خود شناسی ہے۔ آپکو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اُس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر اپنی کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپکی خواہش یہ ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپکے لیے لازم ہے کہ اُس "کچھ اور" کا تعین کریں، اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اسکے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شرط قوت فیصلہ اور قوت ارادی ہے۔ آپکو بہر حال یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہشمند ہیں۔ پھر اس فیصلہ کی رو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اُس ہونے کے مقتضیات کا بار اٹھانے کے لیے آپکو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک پوزیشن سے محبت اور دوسری پوزیشن کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اس پوزیشن سے چمٹ جائے اور کبھی اُس پوزیشن کی طرف لپکے، مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تلون اور تردد کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسکے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اسکی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پتہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اسے اڑائے اڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور انکی جماعتوں کے اعمال میں تلون اور خام کاری کی جو کیفیات ایک مدت سے نمایاں ہیں اور اب نمایاں تر ہو گئی ہیں انکے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام اسباب

کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خود شناسی مفقود ہے اور کہیں قوت فیصلہ و قوت ارادی۔

ایک معتدبہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو سرے سے اپنی خودی کا شعور ہی نہیں رکھتی۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اسکے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کریگی جو مسلمان کو کرنا چاہیے؟

ایک دوسری جماعت، اور وہ بھی معتدبہ، ایسی ہے جو شعور ذات تو رکھتی ہے مگر قوتِ فیصلہ اور قوت ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں، لیکن اس علم نے ان میں محبت اور خوف کے دوگونہ جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ انہیں اپنی اس حیثیت سے محبت ہے، لیکن جو کچھ یہ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کی دہشت ان پر طاری ہو گئی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اسکے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بہت بھاری بوجھ آتا ہے۔ اسکے ساتھ پابندیاں ہیں۔ ایثار اور قربانی ہے۔ جہاد اور مشقت ہے۔ ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہے اور اس لڑائی کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف انکے دل پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کترا کر بھاگتے ہیں، اور کوئی ایسی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انہیں خود بھی معلوم ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اسلیے انکی قوت فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان متردد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چمٹنا چاہتے ہیں مگر اسکے مقتضیات کا خوفناک چہرہ دیکھ کر دور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور لذتوں اور فائدوں کو دیکھ کر اسکی طرف لپکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پورے کافر ہو کر آؤ اور میرے مقتضیات پورے کرو۔ یہ اسکے لیے بھی تیار نہیں، لہٰذا اس سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ اب انکی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ہی ڈھونڈتا ہو، مگر کسی طرف کی بھی ذمہ داریاں قبول کرنے

کے لیے تیار نہ ہو۔

مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اسلیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ انکے مقاصد میں غلطی ہے۔ انکے طریقِ کار میں غلطی ہے۔ انکی قیادت میں غلطی ہے۔ اور انکی روحی کیفیت میں غلطی ہے۔ بہت سے لوگوں کو تو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اسلیے وہ جوش وخروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ انکے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمانوں کا فائدہ ہے" یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ اور بہت سے لوگ جنکو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث ان تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ انکے نفس نے انہیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسی کسی راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو انکے مقتضیات اور انکے نتائج کے ساتھ کھول کر پیش کر دیا جائے، اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔

میں نے ترجمان القرآن میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث اسی توضیح کے لیے چھیڑی تھی[1]۔ اس بحث میں میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے مقتضیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے۔ آپکو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپکے ذہن

[1] ملاحظہ ہو "تفہیمات" جلد اول، مضمون "اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم"

کی اُلجھن اور نظر کے دُھند کو دور کر دیں، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کرلیں اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کو جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ اصولاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے مہلک ہیں۔

ایک جماعت میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لیکر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہو جاتا ہے جسے قومیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔ چند برتاؤ کے ڈھنگ اور چند مطبوع و نامطبوع چیزوں کے معیار ہوتے ہیں جو انکی زندگی میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جنکی ترجمانی ان کا لٹریچر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو انکی کلچر کہا جاتا ہے۔ ان میں طبعاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کلچر، یعنی اسلاف کے اس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاف کیلیے چھوڑ جائیں تاکہ انکی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس معنی میں جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اس میں قومیت کا شعور پیدا ہونے کے بعد طبیعی طور پر یہ خواہش ابھر آتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا ضبط اسکے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مسلط نہ ہونے پائے۔ یہ اس گروہ کا سیاسی مفاد ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معیشت کے جو وسائل اسکے پاس ہیں انکی حفاظت کرے، اور جو مزید وسائل حاصل ہو سکتے ہوں انہیں حاصل کرے تاکہ اسکے افراد زیادہ سے زیادہ خوشحال ہوں۔ یہی چیز ہے جسکو معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اسکے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں کے توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں

سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے انکے سیاسی اور معاشی مفاد، اور انکی کلچر کے تحفظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جسکی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا انکی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسلاً بعد نسلٍ ایک طرح کی زندگی بسر کر کے اپنے اندر دو قومیت' پیدا کر لی ہے؟ کیا وہ کلچر جسے یہ اسلامی کلچر کہتے ہیں، محض موروثی عادات و رسوم اور تاریخی تجارب کا مجموعہ ہے؟ کیا انکے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انہوں نے باپ دادا سے پایا ہے اسکی حفاظت کریں، جن وسائل معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انہیں انکے ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی انہیں اپنے گروہ کے افراد کی خوشحالی کے لیے ضرورت ہے انکو حاصل کریں، اور فی الجملہ انکی اجتماعی زندگی کا ضبط انکے اپنے ہی ہاتھ میں رہے؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی انکی کلچر ہے، اور یہی انکے قومی مسائل ہیں تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔ اس صورت میں:

انکے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ انکی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظام معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ انکے قائد ہوں جنکے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور انکی تمام جد و جہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ انکے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطع نظر اس سے کہ اسلام جسکے نام سے یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اسکو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ انکے لیے تمام تر اہمیت صرف اسی ایک چیز کی ہونی چاہیے کہ ملک کا نظم و نسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہرحال اسکے ضبط میں خود ان کے اپنے افراد کو کافی حصہ ملے تاکہ اپنے آبائی ورثہ (یعنی اپنی کلچر) کو وہ خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں،

رکھ سکیں، اور جس قسم کے بھی فوائد و منافع ملک کی آبادی تقسیم ہو رہے ہوں ان میں سے ایک معتدبہ حصہ انکے افراد کو بھی مل جائے۔

انکے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹیؔ[1] کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کرلیں، بشرطیکہ اس معاملہ میں انکے اپنے گروہ کا فائدہ منظور ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوگا جبکہ معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کو نظر انداز کردیا جائے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (نیشنلزم) پیدا ہوئی ہے اسی طرح ان میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور تمکن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ انکی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیے کی طرح صالح ثابت کریں اور غیر صالح بکریوں کو ہضم کرنا شروع کردیں۔ یہ بھی امپیریلسٹ قوموں کے زمرے میں شامل ہوجائیں، جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں، اور اسی دنیا کی زندگی میں اسی زمین پر اپنے لیے جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا لطف پیدا کرلیں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کرنیکے بعد آپکے لیے یہ سب کچھ درست ہوجاتا ہے۔ مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے دلچسپی ہے۔ نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اسلیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے انکے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کردے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقاء کے میدان میں اتریں اور انتخاب طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا اگر یہ

---

[1] خواہ وہ کانگریس پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹی یا کوئی اور۔

آپ کی قومیت اور یہ آپکی کلچر ہے، اور یہ آپکے قومی مقاصد ہیں، تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپکو حق نہیں ہے، کیونکہ اسلام آپکی اس قومیت اور اس کلچر سے تبری کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپکو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و مفہوم سے تو آپکو کوئی بحث ہے نہیں۔ آپکو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیے سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کر لینگے وہ آپکی مستقل اجتماعی حیثیت پر اُسی طرح دلالت کرنے لگیگا جس طرح اب لفظ "مسلمان"، کر رہا ہے۔ آخر اس نوع کی قومیت میں کونسی خصوصیت ہے جسکے لیے لفظ "مسلمان" ہی کا استعمال ضروری ہو؟

اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اسی لیے نہیں ہے کہ آپکے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اصولاً اسلام کے خلاف ہیں۔ بلکہ اسکی ضرورت اسلیے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کرینگے وہ اسلام کے لیے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپکی حرکات کو دیکھ کر سمجھیگی کہ اسلام یہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اسکو اسلام سے اور زیادہ دور پھینکے گی۔ آپ اپنے "قومی مفاد" کی حفاظت کے لیے غیر اسلامی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کرینگے، اور دنیا یہ سمجھیگی کہ شائد یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو تمہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اُسکے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کرینگے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دنیا اس دنائت کو اسلام کی طرف منسوب کریگی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کرینگے اسلیے کہ وہ آپکے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اسی چیز کی مخالفت کرینگے اسلیے کہ وہ آپکے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملینگے اور کبھی اُسی پارٹی سے لڑینگے، نہ اسلیے کہ آپکے اور اسکے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اسلیے کہ آپکے پیش نظر اصول نہیں "قومی مفاد"، ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپکے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دنیا سمجھیگی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام

پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی فائدے کی تلاش میں ہر طرف لپکیں گے، فاشزم کے اصول یا کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کرینگے، ظالمانہ سرمایہ داری اور مستبدانہ شخصی ریاستوں کے دامن میں بھی پناہ لینگے انگریز اور ہندو اور ریاستہائے ہند، جس کسی کے آستانے پر بھی فائدے کا بت بیٹھا نظر آئیگا اسی کی طرف سجدہ ریز ہونگے، اور یہ سارے رخ آپکے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائینگے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو احسانات کیے ہیں ان کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس طرح اسکی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپکو اسلام سے واقعی محبت ہے، اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپکو یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام یہودیت اور ہندوازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قوم بناتا ہو بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک، اس نظریہ، اس تصور کو لے کر اٹھے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس جس قوم کے جو جو لوگ اسکو قبول کرتے جائیں انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اس کے نزدیک "اسلامی" صرف وہ چیز ہے جو اس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو، اور جو چیز اسکے خلاف ہو اسکو وہ اپنانے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جییں اور اسکو دنیا میں حکمراں بنانے کے لیے جدوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمان گروہ ہونگے۔ ورنہ اپنے لیے جینے اور اپنے مفاد کے لیے جدوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپکا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپکو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

مسلک اسلام کی اس جہانی و عالمی نوعیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھیے کہ ایک عالمگیر مسلک اور جہانی نظریہ کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔

اولاً وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ اسکی فطرت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مداہنت اور مصالحت (Compromise) کرنا اسکے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا بلکہ غالب ہونا چاہتا ہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

ثانیاً وہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطۂ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کلی اور جہانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے اس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس شخص یا اُس طبقہ یا اس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اسکو انسان سے بحث ہوتی ہے، اور وہ اُن مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں، قطع نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ

ثالثاً اسکے پیشِ نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اسکے اصول کے خلاف قائم ہے اسکو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اسکی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور انکی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کا اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائیگا۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موروثی کلچر اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالمِ انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق ــــ نظریات نہیں بلکہ حقائق ــــ دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، ان سب کو بیکروہ اپنے تجویز کردہ نظام اجتماعی میں اپنے

اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے فطری اجزاء (نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جائیں۔ ساد سنگا اسکی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کی فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا اقتضا کرتا ہے کہ اسکے اصولوں کو ایک جنگ آزما تحریک کی بنیاد بنا دیا جائے، اس پر ایمان رکھنے والے اس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اٹھیں، اور بالآخر اسکے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ ود اسلامی جماعت بنکر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اُس قومی پالیسی پر نظرثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اُسے بالکلیہ بدل کر ان مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپکو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑیگا اور اسکی جگہ اسلام کے اصول اور اسکے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرف نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جما دینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپکو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑیگا اور کسی ایسی پارٹی سے جو آپکے اصول نہ مانتی ہو آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکینگے۔ آپکو سختی کے ساتھ ایک با اصول جماعت بننا پڑیگا، اُن ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپکے اصولوں کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے اُن صالحین کو چُن چُن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپکو ابن الوقتی چھوڑ دینی پڑیگی۔ اپنے اصول سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکینگے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپکو ایک ایسی مجاہد جماعت بننا پڑیگا جو اپنے اصول کے لیے لڑنے والی ہو، جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" (National state) قائم کرنا نہ ہو، بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" (Ideological state) قائم کرنا ہو۔ ایسی جماعت جب آپ بنینگے تو آپکو اپنی قیادت میں بھی تغیر کرنا ہوگا۔ اُس وقت آپکے قائد صرف وہ لوگ ہو سکینگے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں اور سب سے زیادہ ان کا اتباع کرنے والے

ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگوں کو صفِ اول میں جگہ مل سکتی ہے۔ مگر جماعتی تنظیم میں اُن کا مقام سب سے پیچھے کی صفوں میں ہوگا بلکہ شائد ان میں سے بہتوں کو کسی صف میں بھی جگہ نہ ملیگی۔

قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ آپ کے سامنے دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ انتخاب و اختیار میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جامد چٹان کی سی ہوگی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہونگی۔ آپ کا اور ان کا مقابلہ اُسی طرح ہوگا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجزا اڑا کر اپنا حجم نہیں بڑھا سکتی۔ نہ ایک چٹان دوسری چٹان کے حیّز میں گھس سکتی ہے۔ انکے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنے اپنے حیّز میں رہنے پر قانع ہو۔ یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسنے کی کوشش کرے۔ پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے، مگر اُسی طرح کی وسعت جیسی فاشست اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے، اور اس سے پہلے امپیریلسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں بس ایک اور مفسد قوم کا اضافہ کر دینگے جو زمین میں کچھ مدت تک فساد پھیلائیگی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائیگی۔

بخلاف اسکے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو محض ایک مسلک اور ایک جہانی نظریہ کے لیے جدوجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر انسان آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہونگے بلکہ ایک نامی جسم کی طرح ہونگے۔

آپکی مثال اس درخت کی سی ہوگی جو ہر طرف اپنے گردوپیش سے اجزاء جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت (World force) ہونگے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولِ حق کے لیے فتح کرنیکی کوشش کرینگے اور اگر واقعی آپکے اصول فطرت انسانی کو اپیل کرنیوالے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں ـــــ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں ـــــ تو دنیا خود اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے آپکے سامنے پیش کریگی۔ آپکے شخصی یا قومی مفاد میں تو کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے۔ اُسکی طرف آپ دعوت دینگے تو دنیا اسکی طرف خود کبھی نہ کھنچے گی بلکہ آپ کو زبردستی اسے کھینچنا پڑیگا۔ لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے، دنیا انکی طرف خود کھنچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جییں اور مریں۔ آپکے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے بنتی چلی گئی کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے رہے ہیں۔ آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد چھوڑ دیں اور انہیں صرف اشتراکیوں کے مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھینگے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائیگی۔

اقلیت و اکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی کلچر، اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اسکے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ سرشماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے جو اس دین کی صورت میں اسکے پاس ہے، اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کند ہتھیار اور اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ رہا ہے اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اسکو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جسکا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی۔ اسکے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے "جماعتوں" کے لیے نہیں۔

جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے: اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے، دلوں اور دماغوں کو اپیل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اُس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لیکر اگر مسلمان عملی مجاہدہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ انکو اُس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوت تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ انکے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالہ کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسراقتدار ہیں ان میں سے کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں

نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا اسکے ارکان بھی ۲۔۳ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑیگا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں ۴۰ کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر ۔۔۔ قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگی عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اسکو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لے لیجیے ہر جگہ آپکو یہی نظر آئیگا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے، اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کراتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جنکی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اِس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش انکی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں، اور وہ دنیوی ترقی و خوشحالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انہوں نے آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے

تک گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جانفشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ انکے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ در حقیقت خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیئے گئے ہیں۔ جو اسلام انکے اندر پایا جاتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائیگا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ انکے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سرِ نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرمانروائی قائم کرنے کے لیے نبرد آزما ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں میں سے اسکو کچھ زیادہ والنیٹر نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکینگے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جنکا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، اُنکو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے۔ اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

اوّل یہ کہ وہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیرووں کے اس "مفاد" کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے کتنے "مسلمانوں" کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں انکو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح تشریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے

لیے محفوظ رکھی جاتا کہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح ملک خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں، اور نہ اسکی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرتِ تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اسکے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کیلیے ایک عملی پروگرام لیکر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہیگا بلکہ شاید ان سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیلِ رواں کو نہ روک سکیگی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیرووں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فیصدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جسکے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اسکی راہ میں جان و مال قربان کرنے کیلیے تیار ہوں، اور پارٹی کے ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسرِ اقتدار آسکتی ہے خواہ اسکے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔

پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے، اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے۔ مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمراں بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی بہت بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔

شکایات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپکی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں، کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپکو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دور کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتایئے کہ یہ مسلمان کس نام سے اس وقت پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

"یہ سچ ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمان برائے نام مسلمان ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے لیکن آخر کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟... کیا جس وقت تک سب راہِ راست پر نہ آجائیں اُس وقت تک اپنے آپکو کوئی مسلمان کہے نہ انکی بہتری کے واسطے انہیں جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافِ انسانیت ہے۔ ضرورت تو اسکی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اسکی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:-

"آپکی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جنکے رویہ سے آپکو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائیگی۔ مگر اب

آپ نے اُن دو تحریکوں اور انکے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہر حال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکے گا کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ فی الحال بری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا ساتھ بھی آپ دینا نہیں چاہتے۔

یہ دو خط منجملہ ان بہت سے شکایتی اور احتجاجی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسکے طرزِ خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا، اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آیند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اتارتا ہوں، اور اچھی طرح اُس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اسکے اندر پاتے ہونگے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقع میں موجود ہے، تغافل کا فائدہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ انکے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اسکی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جسکے نشے میں بعض

سو نو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جنکے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی اُنہیں اسی افیون کی خوراکیں دیا کروں۔ انکی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ حیواں پانی کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دلفریب طلسم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں، بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جنکے لیے ان چیزوں کا سراہنا دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو اس گروہ میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مدعا کے اظہار میں کام لیتا ہے۔ مگر اسکے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اسکی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اسکی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفاد، فلاح و بہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی اُلجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں۔ جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اسکی مخالفت کرتے ہو۔ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے، دوسرے کے نزدیک اُن پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہوگا جسکو فی نفسہٖ فلاح مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔

آئیے، ذرا تحقیق کرکے دیکھیں کہ اس اُلجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مقیّد کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اسکے استعمال میں وسعت ہوتی ہے، اور جب اسے کسی قید کے ساتھ مقید کر دیا جاتا ہے تو اس قید کا لحاظ کیے بغیر اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم رنگ بولتے ہیں تو اسکا استعمال ہر رنگ پر ہوگا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں یا سرخی میں، بہرحال ہم کہینگے کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفیدی کی قید لگا دیں تو سیاہ، سرخ، سبز اور دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکینگے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ" کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے۔ جس طرف بھی وہ بڑھے، اسکی پیش قدمی کو پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اسکا رہبر قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا زادِ سفر اسکا زادِ سفر ہو سکتا ہے۔ غرض اصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہوگی۔ لیکن جب مثلاً عزمِ پشاور کی قید سے مقید کرکے "قافلۂ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلۂ پشاور" کا اطلاق صرف اسی قافلہ پر ہوگا جو عازمِ پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلۂ پشاور۔ اسی

طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائیگی۔ مثلاً قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائیگا، کیونکہ دوسرے راستے پر جتنے قدم وہ چلے گا پشاور کی نسبت سے دور ہوتا چلا جائیگا۔ اس کا میر قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلۂ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے تمام امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ الجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلۂ پشاور"، مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپکا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رخ پر چاہیں سفر کریں بہر حال انہیں کہنا چاہیے قافلۂ پشاور ہی۔ بخلاف اسکے میں قافلۂ پشاور کو اسکے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلہ کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپکے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے انکی حفاظت کی جائے، انکے لیے زادِ راہ درکار ہے، انہیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، انکو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں جب تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپکے اور میرے خیالات میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلانا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا

آتا ہے اور کسی اور طرف کا رخ کرتا ہے۔ آپ ہر میر قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارنے لگتے ہیں کہ چل پڑا پشاوری قافلہ۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلۂ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورت قافلیہ تو بن رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا درست مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافلیہ بن جانے کا نام تو "قافلۂ پشاور" بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میر کارواں کتنا لائق، منتظم اور مدبر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ سہی مگر پشاور کا راستہ بھی جانتا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپکی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کدھر رہی ہے؟ اگر اس کا رخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلۂ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں تو اسکی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اسکی منزل مقصود سے دور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی سڑک بھی لے ہی لینگے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک عزم پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں اس وقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپکا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گذار ہے، اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے، لہذا سردست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ میں نے آپکو دشوار گذار راستہ کی طرف گھسیٹنے پر کب اصرار کیا تھا؟ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلۂ پشاور ہی رہنا متناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرمادیں۔

اس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مقید کو مطلق بناتے ہیں اور اسکے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مقید کو مقید ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے

ذہن کو صاف کرلیں، اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلہ بقید پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدھی، سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اسکی تنظیم اور اسکی پیش قدمی کے قائل ہو [illegible] نفس اجتماع و تنظیم اور نفس پیش قدمی سے کس کافر نے انکار کیا تھا۔ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ یہ قافلہ اگر قافلۂ پشاور نہیں تو اور کس نام سے یاد کیا جائے؟ حالانکہ اُس کا نام تجویز [illegible] مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے [illegible] نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرے، بہرحال قافلۂ پشاور کا نام اس پر راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس سڑک پر یہ جا رہا ہے وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپکو پہلے تسلیم کرنا پڑیگا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں حالانکہ ہمدردی اور بے دردی کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازم پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلافِ واقعہ بات باور کرانا آخر ہمدردی کی کونسی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کر لینگے۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں، میں نہ تو انکا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ اُن سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف انکے ساتھ کوئی بے دردی کروں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو الجھن پیش آرہی ہے اسکی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو اوپر کی

مثال میں بیان کی گئی ہے ۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریق فکر، ایک مقصد زندگی ایک کیرکٹر اور ایک طرزِ عمل کا نام ہے ۔ اس لحاظ سے مسلمان کے معنی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اُس آدمی کے ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر، وہ خاص مقصد اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے ۔ لفظ "مسلمان" کے اِن تقیدات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اُن کا مفاد، انکی تنظیم، انکی ترقی و خوشحالی، انکی قیادت و امارت، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم معین ہو جائیگا ۔ لیکن اگر ان تقیدات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہدے جس چیز کو چاہے انکی فلاح و بہبود قرار دے لے، جس نوع کی تنظیم کو چاہے انکی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی انسانی گلّے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا نظر آئے اسے مسلمانوں کا قائدِ ملت اور امیر مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے ۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہے ۔ "اسلام" کی قید سے قطع نظر کر کے فی الواقع "مسلمانوں" کو محض ایک گروہ اشخاص سمجھ لیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، انکی فلاح و بہبود، انکی تنظیم و جمعیت، انکی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں ۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اسکی رو سے مسلمان مامور ہیں اس پر کہ اُس پورے نظامِ مالیات کو توڑ ڈالیں جو اس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں ۔ پھر یہ الجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپکی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اسکا نام "مسلمان کا مفاد" رکھیں ؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور شریعت ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمان

کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقید کر کے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے تو آپ کا کام اُس نظام حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ نظام تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اسکے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپکے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے اور اس نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درسگاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں، حالانکہ یہ پورا نظام تعلیم انسانیت کی تشکیل ایسے نقشہ پر کرتا ہے جو اسلامی نقشہ کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی غلط تصور آپکے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپکو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اسکے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرز عمل چاہتا ہے، تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام کی رو سے مسلمانوں کی سیاسی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم کرنے اور قانون خداوندی کو حکمراں بنانے کے لیے جدوجہد کرے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کی جائے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ و تمکن ہو اسے محض اس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور اُنکے "استخلاف فی الارض" کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کے رہنما بھی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سب سے

پہلے اسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریق کار کو جانتے ہوں اور اہل تقویٰ و دیانت ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں، یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقویٰ و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اسلیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تعلیم کے استادِ فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر چیں بجبیں ہوتے ہیں اور شکایات کے طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی برانگیختگی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اسلام کے لیے اسلام کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے لیے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انہیں سیدھی طرح ہر اس چیز کو ترک کر دینا چاہیے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقہ پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

راہ رو پشت بمنزل

دُنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں، اور انکے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہیں کیا ہونا چاہیے، اور اس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر انکے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے" کیونکہ اس وقت تنقید کی جائیگی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہونگی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگ جائیگی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انکی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُنکے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا خوب ہی ہو رہا ہوگا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کو موجود ہونگی، ہر وقت ان مصلحتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہینگے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکینگے کہ کونسا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جنکی نظر "کیا ہونا چاہیے" پر ہوتی ہے۔ وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتے

ہیں، اسلیے وہ اسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہلِ حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ انہیں اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی دبخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے شیدائی اسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ ان خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اسکا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یک لخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (Ideal) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اول اول تو اسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور تنبیہ سے نفور رہتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گذرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جنکی نشاندہی تنقید میں کی گئی ہے، اور اگر عام لوگوں کی روح بھی حقیقت میں اسی معیار کو حق تسلیم کرتی ہے جسے مدِنظر رکھ کر ناقد نے حال پر تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتی کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی حالت اور اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضا سے ایک نئی قیادت (Leadership) خود بخود نشو و نما پا کر سامنے

آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف واقع نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جسکی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر "اہلِ حال"، حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو سمِ قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اُسکے لحاظ سے حاضر پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگا کر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے طفرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ تغیر بہر حال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس حالت کو مثال قرار دیتا ہو اُسکے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافت راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروقِ اعظم سے کم نہ ہو اور اسکے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰ اور ابو عبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمٰن ابنِ عوف کے مثل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزلِ مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابۂ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اسکی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اسکے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطحِ زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہر حال میں وہی ذریعہ تلاش کرونگا جو مجھے اوپر کی طرف لے جا سکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اُٹھا سکے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملیگا تو میں سطحِ زمین ہی پر قیام کرنا پسند کرونگا ___ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ

میں اوپر جانے کے ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستہ سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپکو میرے فاترالعقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپکو میرے فتورِ عقل میں اسوقت بھی کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جنکی عملی زندگی میں اور جنکے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جنکا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں[1]، جنکو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اُسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اسکے بعد اگر کوئی چیز انکی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزل مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لیگا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اِس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بنکر چھوٹ سکتا ہے، مگر اس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے — جسکو وہ خود آئیڈیل کہتا ہو — گھبرائے، اسکا نام سُن کر چیں بجبیں ہو جائے، اسکو پامال ہوتے ہو دیکھ کر آفرین و مرحبا کے نعرے بلند کرے، اسکی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم

---

[1] اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "وہ ہمارے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے"۔ دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علم قرآن کے بغیر بھی آدمی اس صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ جمیعت جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے!

دریافت ہوئی ہے جس سے ہم ابھی تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اسکے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جائے تو اسکی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اسکا نام لے دیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اسکے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری و جسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اسکی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہوں میں کوئی مبغوض نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہوتا ۔ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اسکے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اسکے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی ناموں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اسکی کلچر کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین علانیہ توڑے جاتے ہیں، اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔

وہاں "مسلمان" عورت اُسی طرح تبرّج جاہلیت کے ساتھ شمع انجمن بنی نظر آتی ہے جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی مِسِز صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ ناخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لیکر پیروؤں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں، نشست و برخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی کلچر کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا، اور ایک معمولی مسلمان ان حامیان اسلام اور محافظین تہذیب اسلامی کی صحبت میں پہنچ

کر اپنے آپکو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سُنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہ آئیگا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اسکے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائیگا، بلکہ قرآن و سنت کا نقطۂ نظر صریح طور پر انکے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اسکے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائیگا۔ انکی کمیٹیوں اور انکے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سینگے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اسکے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اسکو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپکو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملیگا کہ سمت قبلہ کدھر ہے، اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکیگی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاذ کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکینگے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ اسلامی کلچر جسے کانگریس اور اسکی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، یہی ہے؟ اور یہی اسکے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے، ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومت الٰہیہ تک پہنچا جائیگا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ ـــ یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپکی زبان سے اسلام اور اسکی کلچر کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم کلچر کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا

جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں کلچر کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دورنگی اور گندم نمائی وجو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی وسیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں آپ واقعی مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو بھینچے جائیے تو دیکھنے والا یہی خیال کریگا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اسکا رعب اُٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و خرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں لہٰذا جو مرکز بھی سامنے آئے اسکے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے"، اسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر" اور "تنظیم محض بغرضِ تنظیم"، اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آخر انکا مطمح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اسکی تہذیب

کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورت تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں، اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چڑھائی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپکی گاڑی کو اس طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں چل سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ ہی آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہینگے کہ ماشاء اللہ ہمارا "انجن" اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گذر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپکی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کرینگے؟ جو اس سے علانیہ برسر بغاوت ہیں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ انکے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر ہی کا درد انکے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً انکی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، انکی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور انکا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت انکی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپکے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپکا آخری مطمح نظر ہے، تو بلا شبہ آپکو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے اس سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپکا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ میں وہی بات پھر کہونگا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ

تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد مسلم قوم پرستی کا۔

بعض حضرات اس قسم کی غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ "جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اُس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسی" کو سب مل کر مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس سب لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعہ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (المائدہ ۸)	قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا	پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں
الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبہ - ۲)	تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں التزام جماعت، اور طاعت امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور من شذ شذ فی النار اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سُنائی گئی ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور اُن امامتوں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصول پر دنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر ان ہدایات کو دنیوی جتھے بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر اپنی معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبیعی کے مطابق اپنا جتھا بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانب دار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سواد اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو، لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اسکے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشاد نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سواد اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل اُن مسلمانوں کی اکثریت ہے جنکے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اسکے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی

غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضور نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو انکے ہلڑ کا نام ہرگز اسلامی سوادِ اعظم نہیں ہے۔ نہ انکی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے۔ نہ انکی امارت اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے۔ نہ انکی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو گی انکی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور دورمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اسکی حالت دیکھ کر عقلمند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اوپری خلل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اسکے اپنے نظام جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے، بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں یا انکی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس اصل خرابی کو سمجھیں جو کارگاہ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے اور ساری تدبیریں اسی کو دور کرنے میں صرف کردیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحب عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اسکے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالم انسانی اسوقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اس پر تشنج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین دہل گئی ہے۔ اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں۔ اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گذرتا ہے اس میں بھی وہ کبھی چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے کل ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدتہائے دراز سے یہ صورت حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جارہی ہے، کسی کا ذہن ادھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بجھکڑ اپنی اپنی نظریں صرف اُن خارجی علامات ہی پر جمائے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح

پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اسکا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹر شپ ہے، اسے کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے اسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اسکا خاتمہ کر دو۔ ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے، یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے اور وہ جب تک زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہینگی خواہ قیامت تک ان کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اسکی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی ام الخبائث ہے۔ یہی اصل بس کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجرِ خبیث پیدا ہوتا ہے جسکی شاخیں پھیل پھیل کر انسان پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کر لیں، بجز اسکے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹر شپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائیگا تو حاصل کیا ہو گا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائیگا اور اسکی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائیگی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟

امپیریلزم کا خاتمہ کیا جائیگا تو اس کا حاصل کیا ہو گا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اتر جائیگی۔ مگر کیا واقعی اسکے بعد زمین پر امن اور خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو چین نصیب ہے، جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوئی ہے؟

سرمایہ داری کا استیصال ہو جائیگا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو گا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام

مال دار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائینگے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بیش از بیں نیست کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اسکے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں[1]، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اُس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان "خدا" کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائیگا جسکے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ خواہشات؟

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے سلب ہو کر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور یہ مصیبت کا حل نہیں ہے بلکہ صرف اسکا امالہ ہے۔ اسکے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلابِ بلا اب تک جس راستہ سے آتا رہا ہے اُدھر سے نہ آئے بلکہ دوسرے راستہ سے آئے۔ اسکو اگر حل کہا جا سکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دق کو دور کرنا تھا تو بیشک آپ کامیاب ہوئے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیامِ اجل کو دوسرے پیکِ اجل سے تبدیل کر کے آپ نے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جائے،

[1] تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہ ہو سکی اور عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے۔

بہرحال ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمہ دار اور مسئول رعیت ہے وہ اگر غیر ذمہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس ادعا کی اور ایسے ادعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہرحال وہی کی وہی رہیگی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہیگا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہیگا مگر جب بندہ اس عظیم الشان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اٹھائیگا کہ وہ خود حاکم اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اسکا حاکم اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کریگا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جسکے سامنے وہ جوابدہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جسکی رضا لینے کا محتاج ہو تو یقیناً اسکی زندگی کی عمارت از سرتا پا غلط ہو کر رہ جائیگی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا، اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جسکی قدرت انسان کا اور اس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے اور جسکے حیطۂ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اسکی بنائی ہوئی دنیا میں خود اسکے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک مملوک یہ کہنے کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے مملوکوں کا مالک ہے یا خود اپنا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے

کہ اس سلطنت میں فرمانروائی کرسکے؟ اگر انسان اس مملکت کے اصلی سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اسکے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا ادعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے، سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جسکی تردید زمین اور آسمان کی ہر شے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے، اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقت نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہیگا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہیگا۔ البتہ خود اس انسان کی زندگی از سر تا بقدم غلط ہو کر رہ جائیگی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کریگا۔ حقیقت اسکی محتاج نہیں ہے کہ تم اسکا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں! تم خود اسکے محتاج ہو کہ اسکی معرفت حاصل کر کے اپنی سعی و عمل کو اسکے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اسکو جزوی ترمیمات اور فروعی اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جاسکتا۔ ایک جھوٹ کے ہٹ جانے اور اسکی جگہ دوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہوسکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کی کوئی دوسری صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور اسکی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اُس نظام حکومت کو رد کر دیا جائے جو انسانی اقتدار اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اس نظام حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدار اعلیٰ اُسی کا رہے جو فی الحقیقت مقتدر اعلیٰ ہے۔

ہر اس حکومت کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کردیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحب امر و نہی ہونے کا مدعی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز حکومت تسلیم کیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہوگی، جب تک انسان کی حاکمیت خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائیگی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافت الٰہی کا واقعی (Realistic) تصور نہ لے لیگا، اس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہوسکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹرشپ کی جگہ جمہوریت متمکن ہوجائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہوسکتا ہے، اور اسی کو اختیار کرکے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی و جہد کا صحیح رُخ پا سکتا ہے۔ رب العالمین اور عالم الغیب والشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان و قیاس پر نہیں بلکہ حقائق فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہوسکتا ہے کہ وہ خود صاحب امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دست بردار ہو جائے، خدا پر اور اسکے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لائے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے ہوئے اس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اسکو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا اُسکا مقصود ہو، بلکہ اسے تمام نوع انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جسکے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ و ضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ

زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اسکے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث و مسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی و بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جنکے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر اپنا زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے زور آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمہ پر براہ راست حملہ کرتا ہے، تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیان نازی، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں انکی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے پوچھتا ہے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ؟

"متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اس ایک اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے؟"

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنیوالے ہیں اسلام ان سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ انکی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ اُن میں سے کسی کی دشمنی بھی نفس فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اسلیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اسکی جگہ وہ فساد سر بلند ہو جسکا جھنڈا دوسرا فریق اٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اُسکا اشتراک

عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس کے لیے تو ایک چھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے چھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اسکی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کریگا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو تمام متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت رب الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس ہے۔

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض علم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطور مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریقِ کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریق کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالات زمانہ اور مقتضیات وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہونگے انکو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہرحال سابقہ پیش ہی آئیگا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے۔ اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسب سہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے؟ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے۔ ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جسکو اسلام کے نظریہ، مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نامسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپکا نقطۂ نظر اور طریق کار اُس مسلک کے مطابق ہو جسکے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان سچا مسلمان اسی وقت ہو سکتا ہے

جبکہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطۂ نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں حالات جب سازگار ہو جائینگے تو مسلمان بنکر کام کرنے لگونگا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظام زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اسکا ذہن اسلام کے سانچہ میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جسکی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی کیا پالیسی ہونی چاہیے۔

ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمراں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس للناس[1] کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اسکے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق[2] کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ٹرکی اور دوسرے ملکوں پر خود انکے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں انکا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ مغضوب علیہم کی تعریف میں آسکتے ہیں۔

---

[1] Government of the people by the people for the people

[2] Rulership of God on Man with justice

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں انکی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اہم و اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپکے اس "پاکستان" میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائیگی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپکی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کرینگے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپکو مسلمان کہنے والے وہ کام کرینگے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرا نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی قابلِ لعنت ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔"

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اسکو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائیگی تو کیا بگڑ جائیگا؟ یہ کونسا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بھی بیچ میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اسکی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو

تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھونگا۔

مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لا الٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے، بلکہ اس پر ہے کہ اسکے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اسلیے ہے ـــــ اور مجاہدین حریت میں سے کون صاحب جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اسلیے نہیں ہے؟ ـــــ کہ امپیریلزم کے الٰہ کو ہٹاکر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا اور منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کرسکتا ہے؟ ان اللہ لا یمحوا السیئ بالسیئ ولکن یمحوا السیئ بالحسن ان الخبیث لا یمحوا الخبیث۔[1]

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کررہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر انکے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیان شرع مبین، دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑکر ہوا میں جو بائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہتوا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے

---

[1] یہ حدیث نبوی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بدی بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے مٹتی ہے۔ ایک ناپاک کو مٹاکر دوسرا ناپاک اسکی جگہ لے لے تو ناپاکی مٹی کہاں۔

ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، اور نہ یہ دیکھتے کہ اصلی شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصلی شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اسکو مٹانے کے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اسے محو کرنے پر صرف کر دو۔ اسکے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کرو گے وہ اسی طرح پراگندہ اور رائیگاں ہو کر رہینگی جس طرح ان لوگوں کی مساعی جنکے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بیچاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت اور ہزار حیرت ہے ان علمائے کرام پر جنکا رات دن کا شغلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر انکو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے پر بھی انہیں اُس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کیلئے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن مسائل کو انہوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو انکی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات پر بے چین ہو کر انہوں نے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اسکے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ۔ خواہ بابل کی سرزمین ہو، یا ارض سدوم، یا ملک مدین، یا حِجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو، یا آزاد، ماندہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر۔ ہر جگہ، ہر دور میں، ہر قوم میں، اللہ کی طرف سے آنے والے لیڈروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اُسکے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے" ملحقات

ابراهیمؑ نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم اِس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے، کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ - حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جاکر اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کا مطالبہ پیش کرنے سے پہلے اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا اور قَدْ جِئْتُکُمْ بِبَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ کا دعویٰ پیش کیا اور اسے آگاہ کردیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا، رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی - حضرت عیسیٰ نے جنکی قوم رومیوں کی غلام ہوچکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ

ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے نہیں، اِسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جسکی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی - پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر لیڈر نے ہر ملک، ہر زمانہ اور ہر قوم میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظرانداز کرکے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی بنا پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اُنکے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے -

اب یا تو یہ کہدیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ لیڈر جو خدا کی طرف سے آئے تھے، سب کے سب عملی سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کونسی چیز مقدم اور کونسی موخر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات

کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہیں وہ جزئیات شرع پر خواہ کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہر حال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اُس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظامِ فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظامِ فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانہ میں چلتے رہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ۔ ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انہوں نے دیکھا۔ ہمارا معیار قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی اُنہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرزِ عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبے سے بہت فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویے سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک وطن پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی انکو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں انکے لیے بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم انکے سے ڈھنگ اختیار کریں گے، انہی کی زبان میں باتیں کریں گے، اور انہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ فریفتہ ہیں تو ہم اپنی رفعت کو خود ہی خاک میں ملا دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب یہ اسکی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اسکی وہ پوزیشن تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے

مطالبے، یہ اکثریت اور اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور والیان ریاست کے ظل عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادی وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط پوزیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن اسقدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا سا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔ باقی

چند نایاب اسلامی کتب اور انکی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

تفسیر القرآن مکمل ۸ جلدوں میں (اردو) اصلی قیمت اکیس ۲۱ روپے رعایتی قیمت دس ۱۰ روپے

جواہر قرآنی (اردو) مصنفہ علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصریؒ اصلی قیمت ایکروپیہ رعایتی صرف دس آنے

سیرت رسولؐ (اردو) سیرت النبیؐ معروف بہ سیرت ابن ہشام کا اردو ترجمہ رعایتی قیمت مکمل سٹ۔ ایک روپیہ چار آنے

تاریخ اسلام (اردو) مصنفہ رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ رعایتی قیمت دو ۲ روپے

کلید خزائن قرآنی: کسی آیت کا ایک لفظ یا کلمہ یاد ہو، تو اسکی مدد سے پوری آیت معہ نشان سورۃ و تعداد آیت مل جاتی ہے رعایتی قیمت چار روپے۔ محصولڈاک ہر کتاب کا بذمہ خریدار ہوگا۔ مکمل فہرست کتب مفت طلب کریں۔

پتہ:- منیجر "ایشیا"، ڈاک خانہ وطن۔ لاہور

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہوجاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کماحقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن - لاہور